صبر

جامع تصور اور نفسیاتی کیفیات

خرّم مُرادؔ

منشورات

قیمت: -/11روپے

کوڈ: 00112

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ فون: 3543 4909 فیکس: 4907 3543-042

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ صبر کرو۔ اگر دین دار گھرانہ ہو تو اس پر جو بھی مشکل یا مصیبت آن پڑے، اس پر والدین کی طرف سے یہی نصیحت کانوں میں پڑتی ہے کہ صبر کرنا چاہیے۔ اگر کوئی عام گھرانہ ہو، تب بھی جب کوئی بڑا حادثہ پیش آجائے، یا کوئی عزیز دنیا سے رخصت ہو جائے تو ہر آنے جانے والا شخص یہی کہتا ہے کہ صبر کریں، اللہ کی مرضی کے آگے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ یہ ہمارا صبر سے ابتدائی تعارف ہے جو بچپن ہی سے گھروں میں ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی دنیا میں کچھ بھی حاصل کرنا چاہے، اس کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ زندگی بسر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جس کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہو، اس کی زندگی بھی ہزاروں اندیشوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوتی ہے۔ ہر آدمی اس چیز کی طلب میں رہتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی، اور ہر اس چیز کا رنج و غم کرتا ہے جو اس کے ہاتھ نہیں آسکتی۔ یہ کیفیت اس کی بھی ہے جو دنیا میں بہت کچھ رکھتا ہو اور اس کی بھی جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اسی طرح کوئی بھی مقصد زندگی اگر سامنے ہو، کوئی بھی خواہش پوری کرنی ہو تو ہم سب جانتے ہیں کہ اس کے لیے لگن سے کام اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنی پڑتی ہیں اور ان پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اگر ترغیبات راستے سے ہٹانا چاہیں تو ان کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کو ڈاکٹر بننا ہے تو اس کے لیے اسے محنت کرنا پڑتی ہے، راتوں کی نیند قربان کرنا پڑتی ہے اور بہت سی خواہشات اور تمناؤں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر ڈاکٹر بنا جاتا ہے۔

صبر کا مفہوم

صبر کے کئی مفہوم ہیں، مثلاً کسی کام کو جم کر کرنا، حوصلے سے کرنا، عقل کے ساتھ کرنا۔

کہیں پہنچنا ہو تو اس کے لیے اس استعداد کی ضرورت ہوتی ہے جس کو ہم صبر کے نام سے پکارتے ہیں۔

صبر کے لغوی معنی عربی زبان میں روکنے اور باندھنے کے، یا برداشت کرنے اور سہنے کے ہیں۔ کسی بھی چیز کے ساتھ اگر آدمی اپنے آپ کو باندھ لے اور اس کے اوپر جم جائے تو یہ صبر ہے۔ یہ بھی صبر ہے کہ انسان کے سامنے جو بھی مقصد ہو یا منزل سر کرنا ہو، چاہے یہ مقصد دنیاوی ہو یا اعلیٰ وارفع کوئی اخلاقی مقصد، آدمی اپنے مقصد پر جم جائے اور یہ عزم کرلے کہ جو بھی رکاوٹیں ہوں گی انھیں خاطر میں نہیں لائے گا، خواہ وہ تکلیف کی صورت میں نمودار ہوں یا ترغیب کی صورت میں۔ یہ مشکلات اور رکاوٹیں باہر سے ہوں، یا اپنے اندر سے، یا کوئی راہ میں مسائل پیدا کردے، لیکن انسان اپنے مقصد پر جما رہے۔ کبھی حوصلہ پست ہونے لگے، یا مایوسی ہونے لگے، کبھی محنت سے دل گھبرانے لگے، مستقل کام کرتے ہوئے اُکتاہٹ ہونے لگے، اس کے باوجود کام کرتے رہنا، یہ بھی صبر ہے۔ گویا روکنے اور باندھنے اور سہارنے کے معنوں میں صبر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اگر قرآن مجید کھول کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تو ایک ایسی صفت ہے اور ایسی استعداد ہے جس کے ذکر سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی ہدایت کرتا ہے، اور اس کے مختلف پہلو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان جم کے کام کرے، رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لائے اور ترغیبات کے اوپر قابو پائے۔ لالچ ہو یا خوف، خوشی ہو یا غم، مایوسی ہو یا کم ہمتی، سب کے اوپر قابو پائے۔ دنیا کے اندر اس کا کوئی کاروبار چلتا ہے، کسی نوکری میں اونچا مقام ملتا ہے، تعلیم کے میدان میں کوئی کامیابی ملتی ہے، گھر کی بنیاد رکھی جائے یا تعمیر کیا جائے یا اور بہت سے کام ہوں، ان سب کے لیے صبر کی صفت ضروری ہے۔

قرآن مجید ایک ایسی منزل کی دعوت دینے کے لیے آیا ہے اور ایک ایسی نعمت عطا کرتا ہے جو بالکل مختلف ہے۔ دنیا میں جتنی بھی منازل ہیں، جتنی بھی خواہشات ہیں، جتنی بھی چیزیں ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے کہ وہ ایک

ابدی نعمت، ہمیشہ کی نعمت، یعنی جنت اور رضاے الٰہی کی طرف پکارتا ہے۔ اس لحاظ سے سب سے بڑھ کر صبر کی ضرورت اسی راستے کے لیے ہے۔ جتنی اعلیٰ منزل ہوگی، اتنی ہی محنت کرنا پڑے گی اور اتنا ہی گرنے کا ڈر بھی ہوگا، اور اتنی ہی زیادہ راہ میں رکاوٹیں بھی حائل ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح ترغیبات اور وسوسے بھی بار بار سامنے آئیں گے کہ شاید پیچھے رہ جانے میں ہی فائدہ تھا، یا آگے بڑھنے کی محنت خواہ مخواہ مول لی وغیرہ۔

یہ وہ مختلف نفسیاتی کیفیات ہیں جو کسی بھی اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لیے ہمارے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ جب منزل وہ ہو جس کی وسعت میں آسمان اور زمین سما جائیں تو ظاہر ہے کہ اسی پیمانے سے مشکلیں، رکاوٹیں، مصائب اور ترغیبات سامنے آسکتی ہیں۔ وہ ساری نفسیاتی کیفیات اور جسمانی مصائب جو دوسرے مقاصد تک پہنچنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں وہ اس حیثیت میں کئی گنا زیادہ پیش آتے ہیں۔ اسی لیے جب قرآن مجید نازل ہوا تو شروع ہی میں جو بنیادی ہدایات اس نے اپنے لانے والے کو دیں، وہ یہی تھیں کہ **وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ** (المدثر ۷۴:۷) ''اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔'' پھر چند دن کے بعد دوسری وحی نازل ہوئی: **وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا** ۝ (المزمل ۷۳:۱۰) ''اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں، ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ''، یعنی مخالفین جو بھی باتیں بنا رہے ہیں، تمھیں جھٹلا رہے ہیں، مذاق اڑا رہے ہیں، پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اس پر صبر کرو اور راہِ خدا میں جمے رہو۔ ان لوگوں کو چھوڑ دو اور چھوڑو بھی اچھے اور بھلے طریقے سے۔ یہ دوسری ہدایت سورۂ مزمل کی ہے اور پہلی سورۂ مدثر کی۔ یہ بالکل ابتدائی دنوں میں دی جانے والی ہدایات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو دیں۔ اس کے بعد دین کی راہ پر آگے بڑھنے کے ہر ہر مرحلے میں یہ ہدایات بار بار دہرائی جاتی رہیں۔

مکی دور مظالم کا دور تھا۔ مخالفین پر ہاتھ اٹھائے بغیر سہنے اور برداشت کرنے کا دور تھا۔ جسمانی مصائب اور تکالیف اٹھانے کا دور تھا۔ جب مدنی دور آیا تو ہاتھ اٹھانے کا زمانہ آیا، اس میں جنگ کی نوبت آئی اور جہاد کا راستہ کھلا۔ اگرچہ اس دور میں ہاتھ اٹھانے اور مقابلہ کرنے کی

اجازت تھی مگر اس میں بھی جان و مال کا خطرہ موجود تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب جہاد کی اجازت دی تو ساتھ ہی یہ ہدایت بھی فرمائی:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَىْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَo (البقرة ۲:۱۵۵)

اور ہم ضرور تمھیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمایش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں ان کے لیے بشارت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیا علیہم السلام کو بھی صبر کی ہدایت کی۔ اس میں بھی یہ دو چیزیں موجود تھیں کہ راہ میں آنے والے مصائب پر صبر اور نماز کی روش، کامیابی کی روش ہے۔ اگر کوئی کنجیاں ہیں جو راستہ کھولتی چلی جائیں، جس سے راہ آسان ہوتی جائے، منزل قریب آئے، مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور استعداد پیدا ہو، تو وہ صبر اور صلوٰۃ ہیں۔ سب انبیا علیہ السلام نے اپنی اُمتوں کو انھی دو چیزوں کی نصیحت کی۔ قرآن مجید میں بھی تین جگہ پر مختلف انداز میں یہ بات دہرائی گئی ہے: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ (البقرة ۲:۴۵) ''صبر اور نماز سے مدد لو''۔ گویا جو راستہ تمھارے سامنے ہے، اللہ کی بندگی اور اللہ کی رضا کے حصول کا راستہ، اللہ کی جنت تک پہنچنے کا راستہ، یہ راہ صبر اور نماز کے ذریعے ہی طے ہوسکتی ہے۔ نماز اور صبر کا کیا تعلق ہے، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

قوت کا سرچشمہ

قرآن مجید میں اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں صبر اور تقویٰ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ البتہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تقویٰ کو اختیار کرنے کے لیے نفس کے اندر جس صلاحیت، تربیت اور استعداد کی ضرورت ہے، اس کا نام صبر ہے۔ آدمی ان چیزوں سے رک جائے جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہیں، ان تمام نفسیاتی کیفیات کے مقابلے میں ڈٹا رہے جو انسان کے نفس کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں، ان ساری رکاوٹوں کے مقابلے میں بھی اللہ کی راہ پر جما رہے جو باہر سے آتی ہیں، اس تقویٰ کے حصول کے لیے قوت کا

خزانہ اور سرچشمہ صبر ہے۔ اسی لیے تقویٰ کے ساتھ صبر کا ذکر لازماً اور بڑی کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا گیا کہ مخالفین تمھارے خلاف جو تدبیریں اور ہتھکنڈے اختیار کر رہے ہیں، ان کے مقابلے کے لیے صبر اور تقویٰ اختیار کرو۔

وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ؕ (اٰل عمرٰن ۳:۱۲۰)

ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہوسکتی بشرطے کہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔

امامت کی شرط

قرآن بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بھی زمین میں جن کو امامت عطا فرمائی، یہ وہی لوگ تھے جو صبر میں سچے اور کھرے ثابت ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی امامت اس وقت ملی جب انھوں نے اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھی۔ یہ مرحلہ بھی بڑے صبر کا متقاضی تھا۔ بیٹے نے بھی کمال سعادت مندی کے ساتھ کہا: يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ز سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ؀ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۰۲) ’’ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جارہا ہے اسے کرڈالیے، آپ ان شاءاللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے‘‘۔

بنی اسرائیل کا ذکر آیا کہ مستضعفین تھے، غلام تھے، فرعون کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے، اس کے ظلم و جبر کے تحت پس رہے تھے لیکن ہم نے ان کو مشرق و مغرب کی زمینوں کا مالک بنادیا۔ بنی اسرائیل سے خلافت کا وعدہ اس لیے پورا ہوا کہ انھوں نے صبر کیا۔ جب وہ ان سارے مصائب کے مقابلے میں جمے رہے، جہاد کیا اور قربانیاں دیں، تو اللہ تعالیٰ نے مشرق و مغرب کی خلافت اور حکمرانی ان کے سپرد کردی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ لا بِمَا صَبَرُوْا ؀ (اعراف ۷:۱۳۷) ’’اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا کیونکہ انھوں نے صبر سے کام لیا تھا‘‘۔

اسی طرح جنت کے بارے میں قرآن واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے

مخصوص ہے جو صبر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ وَجَزٰھُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّحَرِیْرًا o (الدھر ۷۶:۱۲) ''اور ان کے صبر کے بدلے میں انھیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا''۔ ایک دوسری جگہ یہ بات مختلف انداز میں بیان کی گئی ہے: اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ o (الزمر ۳۹:۱۰) ''صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا''۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم نے تم سے پہلے بھی اہلِ کتاب کو اس کی ہدایت کی تھی اور تم کو بھی اسی کی ہدایت کی ہے کہ صبر کی روش اختیار کرو۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ برائی کے جواب میں جمے رہنا، اشتعال میں نہ آنا، مخالفتوں کے مقابلے میں اپنے آپ پر قابو رکھنا، ہمت نہ ہارنا، حوصلہ نہ چھوڑنا، مایوسی کا شکار نہ ہونا، اور اشتعال میں آئے بغیر برائی کے جواب میں بھلائی کے راستے پر چلنا، صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ جب انسان نیکی کا حکم دے گا اور منکر سے روکے گا تو یہ اس کے کام آئے گا۔ یہی عزیمت ہے کہ آدمی حالات و مصائب کا جم کر مقابلہ کرے۔ یہ حکم، یہ ہدایت، یہ تاکید، کہ صبر کرو، اس لیے بھی ہے کہ اس کے بغیر دین کا راستہ طے نہیں ہوسکتا۔ اس راستے میں اس کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

صبر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایئے کہ حضرت لقمان نے جب اپنے بیٹے کو نصیحت کی تو اس کو دوسری ہدایات کے ساتھ صبر کی بھی تلقین کی کہ یہ بڑے عزم و حوصلے کا کام ہے:

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ط اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ o (لقمٰن ۳۱:۱۷)

بیٹا! نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ بڑے حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔

آپ غور کریں کہ آیت کا آغاز نماز سے ہوا اور اختتام صبر پر۔ قرآن مجید میں نماز اور صبر دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر آتا ہے۔ اسی طرح جہاں بھی صبر کا ذکر آئے گا کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کا نام بھی آئے گا، اللہ کا ذکر آئے گا، اللہ کی تسبیح کا حکم آئے گا اور اللہ کے قریب ہونے کا ذکر آئے گا۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی تعلیم کی رو سے ایک مومن کے لیے اللہ پر ایمان اور اللہ کی ذات کے ساتھ

تعلق صبر کا سرچشمہ ہے۔ اسی طرح قرآن میں جہاں بھی جہاد کا ذکر آیا ہے وہاں صبر کا ذکر بھی ساتھ آیا ہے کہ اللہ یہ آزما کر رہے گا کہ کون مجاہدہ کرتا ہے اور کون اس کی راہ میں صبر کرتا ہے۔

صبر بے بسی کا نام نہیں

اگر صبر کے یہ معنی ہوں تو اس سے ایک بات بڑی صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ بچپن سے جو کچھ ہم سنتے چلے آئے ہیں وہ اس کا صرف ایک پہلو ہے۔ یہ کہ جب بے بس ہو جائیں، معاملہ ہاتھ سے نکل جائے، ڈاکٹر جواب دے دیں، موت کا فرشتہ آجائے اور جان نکال لے جائے، تب دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ ایسے موقع پر اس کے علاوہ کیا چارہ ہے کہ صبر کیا جائے۔ لیکن قرآن مجید میں صبر کا جو بیان ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بے بسی کی خاموشی یا بے کسی کا نام صبر نہیں ہے، یا قابو نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کر پانا صبر نہیں ہے۔ کچھ کرنے اور کچھ کہنے کا حوصلہ بھی ہو، اس کے باوجود انسان اس سے رک جائے، یہ صبر ہے۔ کسی کام کے کرنے کی استعداد ہو، خواہش بھی موجود ہو لیکن آدمی اس کے مقابلے پر جم جائے۔ صبر بزدلوں یا کم حوصلہ لوگوں کا کام نہیں بلکہ صبر تو بڑی ہمت، بڑی جرأت، بڑی بہادری اور عزم و حوصلے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے بار بار کہا ہے کہ جو صبر کرتے ہیں اور قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دیتے ہیں، اور برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں کہ یہ بڑے عزم و حوصلے کا کام ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ o (الشوریٰ ۴۲:۴۳)

البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

ہم دیکھیں گے کہ صبر بے بسی کا نام نہیں ہے بلکہ صبر بدلہ لینے کی استعداد اور ترغیب کا شکار ہو جانے کے باوجود اپنے مقام پر جمے رہنے کا نام ہے۔ مکی زندگی میں اگر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا نہیں سکتے تھے، بلکہ وہ سب لڑنا جانتے تھے اور مدینہ جا کر انھی لوگوں نے دکھایا بھی کہ وہ کس جواں مردی سے لڑنا جانتے ہیں۔ اس زمانے میں کوئی مسلح فوجیں نہیں تھیں۔ ہر ایک کے پاس تلوار ہوا کرتی تھی اور ہر ایک لڑائی میں حصہ لیتا تھا۔ عرب معاشرے کے اندر اگر کوئی توہین و تذلیل کرے، بے عزتی کرے، قبیلے کے کسی

آدمی کے اوپر ہاتھ ڈال دے یا کوئی خون ہو جائے، تو برسوں بلکہ ایک ایک سو سال تک خون در خون انتقام کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ان کے لیے یہ اجنبی بات نہیں تھی کہ آن بان اور عزت کی خاطر مر مٹیں اور اپنے قبیلے کے خون کا بدلہ لیں۔ لہٰذا مکے میں جو کچھ کیا گیا وہ بے بسی کا صبر نہیں تھا بلکہ ایک سوچا سمجھا راستہ تھا۔ اس کی بنیاد میں بہت ساری چیزیں پوشیدہ تھیں، جن کی یہاں وضاحت کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ صبر بے بسی، لاچاری یا بزدلی کی وجہ سے نہیں تھا۔

صبر کا حقیقی مقام یہ ہے کہ آدمی اپنے مقاصد کی خاطر جم جائے اور پورے عزم و حوصلے سے مال بھی قربان کرے اور جان بھی کھپائے اور ضرورت پڑنے پر جان دینے سے بھی دریغ نہ کرے۔

یہ شاید صبر کی بڑی مختصر تعریف ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے اور جس کو میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ بغیر کسی حوالے کے بیان کیا ہے۔ گویا کہ آدمی کے اپنے اندر سے جو ترغیبات اٹھتی ہیں، جو خواہشات سر اٹھاتی ہیں، جو نفسیاتی کیفیات ہوں اور جو باہر سے رکاوٹیں آئیں، ترغیبات ہوں، کوئی دولت کا لالچ دے یا جان کا خوف حائل ہو جائے، ان سب کے مقابلے میں اپنے مقام پر جمے رہنا، اپنے مقصد کے ساتھ وابستہ رہنا، اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش جاری رکھنا --- یہی دراصل صبر ہے۔

صبر ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں اور ان کو پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے کہ قرآن مجید کن کن حوالوں سے صبر کا مطالبہ کرتا ہے۔

مادی اور نفسیاتی رکاوٹیں

روزمرہ زندگی میں انسان کو جو بھی رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں ان کو ہم بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک مادی رکاوٹیں، اور دوسری نفسیاتی رکاوٹیں۔

مادی رکاوٹوں کے کئی پہلو ہیں۔ کوئی مشکل پڑ جائے، کوئی نقصان ہو جائے، کوئی بڑی خواہش پوری نہ ہو، اور کوئی لالچ بھی ہو سکتا ہے۔ جب ہم رکاوٹ کا لفظ بولتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی قسم کی مزاحمت ہوگی۔ کوئی بھی شے اپنی طرف کھینچ سکتی ہے۔ کسی بھی چیز

کی کشش ہو سکتی ہے۔ یہ وہ مادی رکاوٹیں ہیں جن کا تعلق آدمی کے جسم و جان اور مال سے ہے۔

دوسری قسم کی رکاوٹیں نفسیاتی ہیں۔ ان کی جڑ آدمی کے اپنے اندر، اس کے نفس کے اندر اور اس کے دل و دماغ کے اندر ہوتی ہے۔ یہاں جو چیزیں اٹھتی ہیں وہ اس کو راستے سے ہٹاتی ہیں۔ اس کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں، اس کو ترغیب دیتی ہیں، اس کے اندر خواہشات پیدا کرتی ہیں اور وسوسہ ڈالتی ہیں۔ یہ رکاوٹیں اس طرح کی ہو سکتی ہیں کہ: ایسا کرو گے تو یہ ہو جائے گا، جیب سے پیسہ نکالو گے تو تمھارے پاس کچھ نہیں بچے گا اور تم فقیر اور نادار ہو جاؤ گے، لہٰذا جیب مت کھولو۔ یہ سارے وسوسے جو اندر سے پیدا ہوتے ہیں، یہ نفسیاتی رکاوٹیں ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو فی الواقع اصل چیز وہی ہے جو آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے، لہٰذا اصل رکاوٹیں نفسیاتی رکاوٹیں ہیں۔ مادی مصائب، مادی ترغیبات اور مادی رکاوٹوں کی بھی اصل جڑ آدمی کے نفس کے اندر ہوتی ہے۔ اگر ڈھیر سا مال کسی کو مل جائے، اس کی نظر میں اس مال کی قیمت پتھر کے چند ریزوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اگر اس کا نقطۂ نظر صحیح ہو، اگر اس کو موت کے منہ میں جانا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ موت نہیں ہے بلکہ یہ تو جنت اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا نام ہے، تو موت کا خوف اس کے دل میں نہ رہے گا۔ بڑی سے بڑی چوٹ آدمی کو لگتی ہے مگر اپنے اندر کے حوصلے سے، اپنے اندر کی نفسیاتی کیفیات سے وہ اسے سہار جاتا ہے۔ دوسری طرف ذرا سی مصیبت پڑتی ہے تو آدمی ہمت ہار دیتا ہے اور رونا دھونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا تعلق مصیبت کی مقدار یا آزمایش کی نوعیت سے نہیں ہے کہ آدمی کو کس چیز کا مقابلہ کرنا ہے بلکہ اس کا تعلق اس کے ذہن سے ہے۔ دراصل طاقت کا سرچشمہ انسانی ذہن کے اندر پوشیدہ ہے۔

یہ انسانی سوچ اور جذبہ یا نفسیاتی کیفیت ہی ہے جو اسے دلیر، نڈر اور بے باک بنا دیتی ہے، یا خوف اور ڈر سے پست ہمت یا بزدل۔ ایک کیفیت کے تحت وہ بڑا طاقت ور بن جاتا ہے۔ ایک ایک سپاہی سو سو سپاہیوں کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے، اگرچہ مادی و عسکری لحاظ سے وہ مقابلتاً کمزور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے پاس زیادہ مادی طاقت ہے بلکہ اس کی نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے جو اسے نڈر اور بے باک بنا دیتی ہے۔ دوسری طرف یہ احساس کہ ہمارے

اوپر مصیبت پڑسکتی ہے، یہ ایک دوسری نفسیاتی کیفیت ہے جو ایک فرد کی طاقت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہ بہت سے وسائل رکھنے کے باوجود اور بہت کچھ کر گزرنے کی صلاحیت کا متحمل ہونے کے باوجود، حوصلہ و ہمت ہار دیتا ہے اور عملاً ناکامی و شکست سے دوچار ہو کر رہتا ہے۔

خوف اور حزن

اگر غور کریں تو ہم ان تمام نفسیاتی کیفیات کا دو حوالوں سے جائزہ لے سکتے ہیں: ایک خوف اور دوسرا حزن۔

خوف کے معنی ہیں ڈر یا اندیشہ کہ کچھ ہو جائے گا، جو ملنے والا ہے وہ نہیں ملے گا، یا کوئی ایسی چیز مل جائے گی جو ناخوش گوار اور ناقابل برداشت ہوگی اور نقصان کا باعث ہوگی۔

حزن سے مراد اس بات کا غم کہ کچھ چھن گیا یا نقصان ہو گیا، کوئی ضرب پڑ گئی، کوئی چیز ملنا چاہیے تھی نہ ملی اور جو چیز نہ ملنا چاہیے تھی وہ مل گئی۔غم کی اس کیفیت کو حزن و ملال کہا جاتا ہے۔

دراصل نفس کے اندر کی یہ وہ کیفیات ہیں جن سے اصل رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔اگر آدمی خوف اور اندیشوں پر پہلے سے قابو نہ پائے تو جن چیزوں کا خوف و اندیشہ اس کو لاحق رہتا ہے وہ اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ خدشات کہ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ ہو جائے گا، ایک چیز جو ہاتھ لگنے والی ہے اگر ہاتھ نہ لگی تو یہ بڑا نقصان ہو جائے گا، میری عزت کو، میری دولت کو، معاشرے میں میرے مقام و مرتبے کو نقصان پہنچ سکتا ہے، سیاسی، مادی، مالی یا جو کچھ بھی حیثیت ہے، ہاتھ سے نکل جائے گی___ یہ خوف و خدشات جب آدمی کے اوپر طاری ہوتے ہیں، تو پھر بالآخر وہ ان کے ڈر سے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

دوسرا پہلو غم اور حزن کا ہے، یعنی یہ کہ جو چیز حاصل تھی وہ ہاتھ سے نکل گئی، کوئی مر گیا یا مال کا نقصان ہو گیا، یا کسی نے عزت کے اوپر حملہ کر دیا، گالی دے دی وغیرہ۔ جب کوئی نقصان ہو جاتا ہے یا عزت تک ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو آدمی کو اس کا غم ہوتا ہے۔غم ہو تو پھر غصہ بھی آتا ہے۔غم و غصہ کا لفظ تو ہماری زبان میں، اردو ادب میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں غم پیدا ہوتا ہے وہاں غصہ بھی لازماً آتا ہے، کہ یہ چیز کیوں ہمارے ہاتھ سے نکل گئی، میری عزت پہ یہ حملہ کیوں

ہوگیا، جو چیز مجھے ملنے والی تھی وہ کیوں کوئی چھین کے لے گیا۔ اس طرح ایک طرف تو غم ہوتا ہے جو غصے کے اندر تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر غصہ بالآخر اشتعال دلاتا ہے اور اس اقدام پر مجبور کرتا ہے جو صبر کے منافی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں نیک بندوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کی اس صفت کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ نہ خوف اور اندیشے کا شکار ہوں گے اور نہ کسی غم کے اندر مبتلا ہوں گے۔ جنت کے بارے میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ o (البقرہ ۲:۳۸)، یعنی جنت کی زندگی کی بھی یہی خصوصیت ہے کہ وہاں نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی چیز کے چھننے کا خدشہ ہوگا۔ کوئی مصیبت پڑنے کا خوف بھی دل کے اوپر طاری نہیں ہوگا، اور نہ کوئی چیز ہاتھ سے نکل جانے کا غم و غصہ ہوگا بلکہ اطمینان ہوگا کہ صحیح زندگی گزار آئے اور صلہ پالیا۔ کوئی حسرت نہیں ہوگی کہ یہ کام کیوں نہیں کیا اور اگر یہ کرتے تو یہ پیش نہ آتا۔ اگر غور کیا جائے تو دراصل یہی دو چیزیں ہیں جو صبر کے سرچشمے کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں، اور صبر کے راستے میں جو چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں ان کا اظہار بھی انھی دو باتوں سے ہوتا ہے، یعنی خوف اور حزن۔

مختلف نفسیاتی کیفیات

اگر اس بات کو مزید واضح کیا جائے تو یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ جو نفسیاتی کیفیات انسان کے اوپر طاری ہوتی ہیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی طاری ہوا کرتی تھیں۔ یہ مسلمانوں کے اُوپر بھی طاری ہوا کرتی تھیں۔ ان کیفیات کو قرآن مجید نے کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اگر ہم ان میں سے ایک ایک چیز کو دیکھیں تو اس کے اندر ہمارے لیے سبق اور نصیحت کا بہت بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔ میں جسمانی و مادی مصائب کا ذکر نہیں کر رہا، یعنی جو مار پیٹ ہوئی، جو جانیں دینا پڑیں، جو محنت کرنا پڑی، اور جان و مال کا جو نقصان ہوا، اس لیے کہ اس کی جڑ بھی نفسیاتی رکاوٹوں کے اندر ہے۔ دراصل آدمی اپنے اندر سے اٹھنے والی کیفیات اور جذبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ جو دعوت لے کر آئے، جو پیغام آپ ﷺ نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا، یہ دعوت اور یہ پیغام آپ ﷺ کے لیے اتنا کھلا، واضح اور روشن تھا کہ جیسے عام آدمی کے لیے دن

میں آسمان پر چمکتا ہوا سورج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ، آخرت، اور جنت و دوزخ، یہ ساری چیزیں ہماری نظروں سے محو ہیں لیکن نبی ﷺ کے لیے یہ ساری چیزیں غیب سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔

نبی کو تو اللہ تعالیٰ براہ راست علم دیتا ہے۔ جس طرح دن کی روشنی میں ایک عام آدمی دیکھ سکتا ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے اور یہ اس کے لیے ایک کھلی حقیقت ہوتی ہے، یہی کیفیت نبی کی اللہ اور آخرت کے بارے میں ہوتی ہے۔ اب اگر آدمی دن کے اجالے میں کھڑا ہو کر یہ کہے کہ لوگو، سورج نکلا ہوا ہے لیکن لوگ اس کھلی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں، اس کے برعکس اس کو ملامت کریں، طعنے دیں کہ تم اندھے ہو گئے ہو، تم پر جادو کر دیا گیا ہے، تم شاعری کر رہے ہو، تم پر جنون ہو گیا ہے، اسی لیے تمھیں رات کے وقت سورج نظر آ رہا ہے، یا سورج نہیں نکلا ہوا اور تم کہہ رہے ہو کہ نکلا ہوا ہے۔ کسی نے تم کو چکمہ دے دیا ہے، یا باہر سے کوئی چیز تمھارے اوپر آ گئی ہے، کوئی تمھارا استاد ہے جو تمھیں باتیں گھڑ گھڑ کر دیتا ہے وغیرہ۔ گویا نبی جو چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، دنیا اس کو جھٹلانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس موقع پر انسان جن کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، یا گزرتا ہے وہ نفسیاتی کیفیات کہلاتی ہیں۔

دعوت حق قبول نہ کرنے پر اضطراب

ایک نبی بھی اس نفسیاتی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ نبی کے لیے سب سے پہلی آزمایش یہی ہوتی ہے کہ جس حق کی دعوت لے کر وہ اٹھا ہے اس کو جھٹلایا جائے۔ یہ جھٹلانا معمولی جھٹلانا نہیں ہوتا۔ جو آدمی جانتا ہو کہ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں سچی اور برحق ہے، مگر اسے جھٹلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ تم بے وقوف ہو، تم جھوٹے ہو، تم کو دھوکا ہو گیا ہے، تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے، اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے وہ شدید غم اور حزن کی کیفیت ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کو اس بات کا غم ہوتا تھا کہ لوگ سچی بات کیوں نہیں مانتے، اور نہ صرف یہ کہ کھلی حقیقت کو جھٹلاتے ہیں بلکہ مذاق بھی اڑاتے ہیں اور طرح طرح سے اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے: لَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ (یونس ۱۰:۶۵) ''اے نبی ﷺ، جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں''۔

قرآن مجید میں کئی جگہ کہا گیا ہے: وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (المزمل ۷۳:۱۰) ''جو کچھ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو''۔ اس لیے کہ سب سے بڑا فتنہ اور آزمایش تو لوگوں کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ یہ باتیں جو لوگوں کی زبان سے نکلتی ہیں، خواہ لوگ کان میں آکر کہیں، مجلس میں بیٹھ کر کہیں، کتابوں میں لکھ کر چھپوائیں یا اخبار میں شائع کریں، یہ بڑی سخت آزمایش ہوتی ہے۔ کوڑے کی مار، پتھر کی چوٹ اور ریت پر گھسیٹا جانا شاید اتنی سخت آزمایش نہ ہوتی ہوگی جتنی سخت آزمایش طنز، طعن و تشنیع اور مذاق و استہزا سے ہوتی ہے۔ یہ اندرونی چوٹ زخم کاری کی مانند ہوتی ہے۔ اس کی زد آدمی کی عزت نفس، اس کی سچائی، اس کے کردار اور مقام و مرتبے پر بھی پڑتی ہے۔ یہ جسمانی چوٹ سے زیادہ گہری چوٹ ہوتی ہے۔ اسی پر قرآن نے کہا:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (المزمل ۷۳:۱۰)
جو کچھ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔

مایوسی و ناامیدی

اس غم اور حزن کو برداشت کرنا صبر ہے۔ اس سے آدمی مایوس بھی ہوتا ہے۔ اس مایوسی کا ذکر قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے۔ جو آدمی بات نہ مانے، بار بار کہنے کے باوجود نہ مانے، ہر قسم کی دلیل سننے کے باوجود بھی نہ مانے، نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی تسلیم نہ کرے، اور پھر پہلی قوموں کا بھی ذکر ہوا ہے کہ برسوں دعوت کا کام ہوا لیکن ان لوگوں نے مان کے نہیں دیا، تو پھر آدمی کے اوپر مایوسی طاری ہوتی ہے۔ مایوسی اندورنی کیفیت ہے اور غم کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے اور آدمی کے اوپر طاری ہو جاتی ہے۔ جب لوگ نہیں مانتے اور سچی بات کو جھٹلاتے ہیں تو آدمی کو اس سے دکھ ہوتا ہے جو مایوسی کا باعث بنتا ہے۔

اللّٰہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے نبی ﷺ کے لیے حزن کا لفظ کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ اسی حزن سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ مایوسی کا قرآن پاک نے بار بار علاج کیا اور اس کے لیے مختلف طرح سے تسلی دی اور حوصلہ دیا کہ اگر یہ لوگ نہیں مانتے ہیں تو یہ ان کی اپنی غلطی اور اپنا قصور ہے۔ آپ ﷺ کا کام تو بس اتنا ہے کہ آپ ﷺ لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔

زبردستی منوانا آپ ﷺ کا کام نہیں ہے۔ ہم نے آپ ﷺ کو داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ہے اور نہ ان کے سر پر مسلط کیا ہے۔ ماننا یا نہ ماننا، ان کا اپنا اختیار ہے۔ آپ ﷺ ان کے سامنے حق پیش کرتے رہیں، جو قبول کرے گا وہ اپنی آزادمرضی سے قبول کرے گا اور جو انکار کرے گا وہ اپنی آزادمرضی سے انکار کرے گا۔ ان کا فیصلہ ہم نے آپ ﷺ کے ہاتھ میں نہیں دیا ہے۔ اگر انھیں زبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو کیا اللہ تعالیٰ کے پاس خود کم طاقت تھی۔ وہ یہ سب کام کیوں کرتا کہ نبی ﷺ کو بھیجتا، دعوت کا کام کرواتا، کتاب اتارتا، اس کے لیے تو وہ ایک کلمہ کن کہتا اور سارے لوگ ایک ہی راستے پر آجاتے: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً (ھود ۱۱:۱۱۸) ''بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا''۔ سب اس کی بندگی کرتے، سب فرشتوں کی طرح ہو جاتے۔ لیکن فرشتے تو پہلے سے موجود تھے۔ انسان کو تو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے اختیار کے استعمال کی آزمایش ہو۔ وہ اپنے ارادے سے اور اپنے فیصلے سے راہِ حق پر آئے۔ اس کے لازمی معنی ہیں کہ جو آدمی چاہے گا مانے گا اور جو نہیں چاہے گا نہیں مانے گا۔ لہٰذا تمھیں مایوسی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس طرح قرآن مجید نے اس حقیقت کو باور کیا کہ اگر ایک داعی اس بات کو بخوبی جانتا ہو کہ اس کا کام تو احسن انداز میں لوگوں تک پہنچانا ہے اور اس کا ماننا نہ ماننا، قبول کرنا یا رد کرنا، لوگوں کا اپنا اختیار ہے، اور وہ اس بات کا مکلّف نہیں کہ لازماً لوگ حق بات کو تسلیم کریں، تو پھر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

عجلت پسندی

ایک کیفیت آدمی پر یہ طاری ہوتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ معاملہ جلدی سے نپٹ جائے، جب کہ یہ جدوجہد ایک طویل جدوجہد ہے۔ یہ تو یقین ہوتا ہے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا اور اس کا دین غالب آئے گا۔ یہ اللہ کا اپنے رسول ﷺ سے بالکل حتمی و یقینی وعدہ ہے کہ تمھارا کام ضرور مکمل ہو کر رہے گا، خواہ یہ تمھاری زندگی میں ہو یا موت کے بعد۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ اس دین کو ضرور غالب کر کے رہے گا۔ یہی وعدہ نبی

کریم ﷺ کے ساتھ تھا اور آپ ﷺ کی جانشین اُمت، مسلمانوں سے بھی ہے، لیکن آدمی کی طبیعت میں عجلت پسندی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر کام جلد سے جلد ہو جائے۔ کافروں کے بارے میں عذاب کی جو دھمکی ہے وہ بھی ذرا جلد آ جائے، اور جس منزل کا وعدہ ہے کہ دین غالب ہوگا، وہ بھی جلد سر ہو جائے۔ بسا اوقات نبی کریم ﷺ بھی پریشان ہو کر اس طرح سوچنے لگتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جلدی مت کرو۔ **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ** (القلم ۶۸:۴۸) ''اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ۔'' یہاں حضرت یونس علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب ان کی قوم نے برسوں دعوت کے کام کے بعد مان کے نہیں دیا، تو وہ مایوس ہو گئے اور اسی جلد بازی کی وجہ سے بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی طرح نہ ہو جاؤ بلکہ اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کے ساتھ دعوت کا کام کیے چلے جاؤ۔ **فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ** (الاحقاف ۴۶:۳۵) ''پس اے نبی ﷺ، صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو''۔

جلد بازی صبر کے منافی ہے۔ جلد بازی مایوسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حزن سے مایوسی پیدا ہوتی ہے اور پھر مایوسی سے جلد بازی۔ اگر آدمی کو امید بندھی رہے کہ میرا کام ہو جائے گا اور ہو کر رہے گا اور اس کا وقت مقرر ہے تو پھر وہ اتنی جلد بازی نہیں کرے گا۔ جلد بازی آدمی تب کرتا ہے جب اس کو خود پر یقین نہ ہو اور مایوسی ہو۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ یہ کام اس طرح تو نہیں ہوگا، کچھ اور کرنا چاہیے یا کوئی اور راہ نکالنی چاہیے۔ اسی کے نتیجے میں عجلت پسندی یا جلد بازی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ ط** (النحل ۱۶:۱)''ان کے بارے میں جلد بازی نہ کرو''۔ اس لیے کہ ہم نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، تمھارے ہاتھ میں نہیں دیا۔

خدا کی مدد اور وعدوں پر شک

اسی حزن وغم کے نتیجے میں جو اگلی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ وعدے بھی مشکوک نظر

آنے لگتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کیے ہیں۔ اللہ کے نبی تو اس کیفیت میں مبتلا نہیں ہو سکتے، لیکن یہ ضرور پکار اٹھتے ہیں: مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ (البقرۃ ۲:۲۱۴) ''اللہ کی مدد کب آئے گی''؟ ان کو شک تو نہیں ہوتا لیکن اس بارے میں شبہہ ہونے لگتا ہے کہ کبھی ہم منزل پر پہنچ بھی پائیں گے یا نہیں۔ اس بارے میں ہدایت یہ ہے فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ (الروم ۳۰:۲۰)، یعنی صبر کرو، راہ خدا پر جمے رہو، اور اللہ نے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ اس کا وعدہ بالکل سچا ہے۔

انسان کے لیے آخری خطرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ پر چلا جائے، اور مخالفین کے ساتھ ملنے کی کوشش کرے کہ وہ چھائے ہوئے ہیں، غالب ہیں، اور انھی کا سکہ چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نبی ﷺ کے بارے میں یہ خدشہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے، مگر نبی ﷺ کو مخاطب کر کے نبی ﷺ کے ماننے والوں کو ہدایت دینا مقصود ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ (الدھر ۷۶:۲۴) ''تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو، اور ان میں سے کسی بدعمل یا منکرِ حق کی بات نہ مانو''۔ گویا اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو اور اس کے لیے صبر کرو۔ یہاں انتظار کا لفظ استعمال نہیں ہوا، میں نے ترجمہ کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صبر کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔ اس کام میں لگے رہو اور جو غلط کاروں کا گروہ ہے، ان کے ساتھ ملنے کا مت سوچو۔ یہ کسی بے صبری کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ چیز صبر کے منافی ہے۔

خوف اور حزن کا علاج

اگر غور کیا جائے تو یہ سب نفسیاتی کیفیات حزن سے پیدا ہو رہی ہیں۔ ایک چیز جو ہم چاہتے ہیں کہ وہ نہ ہو، مگر ہو جاتی ہے تو ہمیں اس کا غم ہوتا ہے۔ اسی طرح جو چیز ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہو جائے اور نہ ہو تو ہمیں اس کا غم ہوتا ہے۔ اس غم سے مایوسی، کم حوصلگی اور پست ہمتی اور بہت ساری کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ جلد بازی اور بے یقینی کی ساری کیفیات بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہر ایک کے علاج کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے، کہ اِصْبِرُوْا، اِصْبِرُوْا، یعنی صبر کرو اور اپنے کام پر جمے رہو اور صبر سے مدد چاہو، اپنے آپ کو اس سے باندھ کر رکھو، اپنے

آپ کو ایک مقام پر روکے رکھو۔ اس لیے کہ یہی ان چیزوں کا علاج ہے۔

دوسری کیفیت خوف کی ہے۔ اس بات کا خوف کہ کل نہ جانے کیا ہو جائے۔ اسی طرح جان کا خوف ہوتا ہے، مال کے ضائع ہونے کا خوف ہوتا ہے، اور دنیا کے اندر جو عزت اور وقار ہے اس کے چھن جانے کا خوف بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تمام خوف اور اندیشے انسان کے اوپر حاوی ہیں۔ زندگی آدھی تو حسرت کی نذر ہو جاتی ہے کہ کیا نہیں ہو سکا، اور آدھی خوف کی نذر ہو جاتی ہے کہ نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ اس کا علاج بھی صبر ہے۔ چناں چہ جہاں اللہ تعالیٰ نے ابتلا و آزمایش کا ذکر کیا، وہاں سب سے پہلے خوف کا ذکر کیا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ (البقرۃ ۲:۱۵۵)۔ اسی طرح دشمن کے حملہ آور ہو جانے اور مسلط ہو جانے کا خوف ہوتا ہے۔ دیگر ہزاروں اندیشے اور خطرات ہوتے ہیں جو آدمی پر طاری ہوتے ہیں۔ وہ لرزتا ہے، کانپتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے کہ پتا نہیں کیا ہو جائے، رشتہ دار ساتھ چھوڑ دیں گے، دوست ساتھ نہ دیں گے، اور پتا نہیں کیا کیا نقصان ہو جائے۔ فرمایا کہ اس خوف سے ہم آزمائیں گے۔ اس خوف کا علاج بھی صبر ہے۔ خوف کے مقابلے میں جمے رہنا اور پیچھے نہ ہٹنا بھی صبر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین کے راستے پر جمنے اور ہر طرح کی قربانی دینے کی بھی ہدایت کی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو باپ کے ذریعے حکم ملا کہ تمھاری جان مطلوب ہے تو انھوں نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۰۲) ''اس نے کہا، ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے''۔ یہ صبر عام قسم کا نہیں تھا بلکہ بڑے عزم اور حوصلے کا صبر تھا کہ میری جان حاضر ہے۔ اس کے لیے تیار ہوں۔ یہ اللہ پر توکل تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دین کے دوسرے احکام نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد سب کے ساتھ صبر کا ذکر کیا ہے۔ کیوں کہ صبر کے بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر عمل نہیں ہو سکتا۔

مخالفت پر رویہ

دعوت کی راہ میں بہت سی مخالفتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو چیزیں سہی اور برداشت کی

جاتی ہیں، ان پر آدمی کو صدمہ اور غم ہوتا ہے۔ اس میں مخالفین کے ساتھ روش کے حوالے سے بھی صبر کی تاکید ہے۔ صبر کے کچھ ایسے پہلو ہیں جو عموماً نگاہوں سے محو ہو جاتے ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم پر کوئی سختی کرے، کوئی نقصان پہنچائے، تو تمھیں بھی اس کی اجازت ہے کہ جتنا اور جس طرح تم کو نقصان پہنچایا گیا ہے، تم بھی اس کو پہنچاؤ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ o (النحل ۱۲۶:۱۶)

لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِo (الشوریٰ ۴۳:۴۲)

البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ نے متقین کی صفات بیان کی ہیں، ان کے لیے جنت کا وعدہ کیا ہے جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں، وہاں اس نے جن صفات کا ذکر کیا وہ یہ ہیں:

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط (اٰل عمرٰن ۱۳۴:۳)

جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔

خرچ کرنے کے لیے بھی حوصلے اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک پہلو ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ خوبیاں ہیں کہ برائی کو بھلائی سے دفع کرو۔ برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ ایک جگہ ان لوگوں کا جو اللہ کی جنت میں جائیں گے یوں ذکر کیا: وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (الرعد ۲۲:۱۳) ''ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں''۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ

وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ○ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ○ (حٰم السجدۃ ۴۱: ۳۴-۳۵) ''نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں''۔ گویا اخلاق کے اعلیٰ مقام تک وہی پہنچتے ہیں جو برائی کا جواب بھی بھلائی سے دیتے ہیں۔ برائی کو تو وہی چیز مٹا سکتی ہے جو بھلی اور اچھی ہو۔

جسمانی مصائب اور موت کا خوف

یہ وہ مختلف نفسیاتی کیفیات ہیں جو صبر کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس کے بعد پھر جسمانی مصائب اور جسمانی تکالیف ہیں۔ اگر اس حوالے سے بھی آدمی کا تصور واضح ہو تو وہ ہر طرح کے ظلم و جبر کو برداشت کر سکتا ہے، حتیٰ کہ جان بھی دینا پڑے تو بے خوف جان دے گا۔ جب یہ بات واضح ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے، لہٰذا موت کوئی ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ اس چیز سے کیا ڈرنا جس کا نہ تو وقت معلوم ہو، نہ جسے روکا جا سکتا ہو، نہ اس سے بچا جا سکتا ہو، نہ اس کو ٹالا جا سکتا ہو اور نہ اس سے چھپ کر کہیں جایا جا سکتا ہو، اور نہ ایک گھڑی آگے کی جا سکتی ہو اور نہ پیچھے۔ بہت بے وقوفی ہے کہ آدمی اس سے ڈرے۔ ڈرنا تو اس چیز سے چاہیے کہ جو اس کے بعد پیش آنے والی ہے، جسے ٹالا جا سکتا ہے، جس سے بچا جا سکتا ہے اور کچھ کر کے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے، یعنی آخرت۔ لہٰذا جس کو یہ معلوم ہو کہ موت کا وقت مقرر ہے تو پھر اس کو کبھی بھی موت کا خوف لاحق نہیں ہو سکتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے کہ دو دن ایسے ہیں کہ جب میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ایک دن تو وہ ہے کہ جس روز موت کو نہیں آنا۔ اس دن موت سے ڈرنے کی کیا ضرورت، اس لیے کہ اس روز تو اس کو نہیں آنا۔ دوسرا دن وہ ہے جس دن موت کو آنا ہے۔ اس دن بھی موت سے کیا ڈرنا کہ اس دن ڈرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں یہ بات کہی ہے کہ یا تو آج کے دن موت کو آنا ہے، یا آج کے دن موت کو نہیں آنا۔ اگر آج کے

دن موت کو آنا ہے تو ٹل نہیں سکتی، لہٰذا ڈرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر موت کو اس روز نہیں آنا تو خواہ مخواہ آدمی کیوں ڈرے، ۔ یہ تصور موت سے بے خوف کر دیتا ہے اور آدمی کے اندر صبر و ہمت پیدا کر دیتا ہے۔ پھر وہ عزم اور حوصلے کے ساتھ جما رہتا ہے۔

صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں نے ان میں سے صرف چند پہلو سامنے رکھے ہیں۔ قرآن مجید اسے کہیں صبر کے نام سے اور کہیں نام لیے بغیر صبر کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ کہیں اپنے نبی ﷺ سے خطاب کرتا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی صبر کا سامان ہوتا ہے اور کسی نہ کسی خزانے کا منہ کھولتا ہے، جہاں سے دعوت کا کام کرنے والا صبر کا خزانہ حاصل کرتا ہے۔ کوئی چشمہ ایسا بہتا ہے کہ جہاں سے کوئی فیض ملے۔ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی جس طرح اپنے مقام پر، اپنے موقف پر، اپنے کام اور اپنے مقصد کے اوپر جمے رہے، وہ اسی صبر کا نتیجہ تھا اور بالآخر ساری دنیا کے وارث بن گئے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے صرف فلسطین عطا کیا تھا، لیکن حضور ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک پوری دنیا صبر کی وجہ سے عطا کر دی۔ یہ صبر کا نتیجہ تھا اور وہ صبر کے مقابلے میں کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

صبر اور ذرائع قوت

صبر کا سرچشمہ دراصل یہ احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز قائم ہے، اور ہم ہر وقت اللہ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں سورۂ مدثر میں سورۂ اقرأ کے بعد دوسری یا تیسری وحی میں یہی ہدایت فرمائی: وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ○ (المدثر ۷۴:۷) ''اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو''۔ گویا اپنے رب کی خاطر اور اپنے رب کے لیے جم جاؤ، اور یہ سمجھو کہ میں اپنے رب کے لیے کام کر رہا ہوں، رب کا کام کر رہا ہوں اور رب کی راہ میں ہوں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔ قرآن پاک نے اس طرح بار بار صبر کی تلقین کی ہے۔ ایک مقام پر فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ○
(الطور ۵۲:۴۸)

اے نبی ﷺ، اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو۔ تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کے دربار میں بھیجا تو انھوں نے کہا کہ ہم فرعون کے دربار میں جائیں گے لیکن میرے او پر خون کا دعویٰ بھی ہے اور مجھے ڈر اور خوف بھی ہے۔ اس پر فرمایا: اِنَّنِیۡ مَعَکُمَاۤ اَسۡمَعُ وَاَرٰی (طٰہٰ ۲۰:۴۶) ''ڈرومت، میں تمھارے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں''۔ گویا تم جس حال میں بھی ہوگے، میں سن بھی رہا ہوں گا اور دیکھ بھی رہا ہوں گا۔

دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات صبر کا سرچشمہ ہے۔ جب آدمی کو یقین ہو جائے کہ جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، کوئی چیز بھی میری اپنی نہیں ہے۔ یہ دین بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ لوگوں کو دین کی راہ پر لانا، ان کے دلوں کو حق کی طرف موڑنا، یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو ہوگا، اور اگر نہیں چاہے گا تو نہیں ہوگا۔ سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (البقرۃ ۲:۱۵۶) ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے'' میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ دراصل وہ چھوٹا سا کلمہ ہے جس کے اندر صبر کی ساری دنیا پنہاں ہے۔ اسی لیے حادثے اور صدمے پر اسی کو پڑھا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جس سے آدمی صبر حاصل کر سکتا ہے۔ گویا کوئی چیز میری اپنی نہیں ہے، اللہ کی ہے۔ سب چیزوں کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اس کا انجام وہیں پر ہونا ہے۔

اسی طرح نماز کو صبر کے ساتھ اس لیے جوڑا گیا ہے کہ نماز میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ ہیں، وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِاللّٰہِ، ''اللہ سے مدد مانگو''۔ اور وہی الفاظ پھر ہیں کہ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ کہ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد مانگو۔ صبر کا لفظ انھوں نے خود کہا۔ اللہ کی مدد کے لیے صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے کہ صلوٰۃ تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا نام ہے۔ اللہ کے سامنے حاضر ہونے، اللہ سے بات چیت اور اللہ سے قرب کا نام ہے۔ سجدہ کرتے وقت آدمی اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ

قریب ہوتا ہے۔ جب اس کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کے دربار میں حاضر ہوجاتا ہے۔ اسی لیے تو نماز اللہ کی یاد اور اللہ کے قرب کا نام ہے، نیز نماز صبر کا سامان فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے:

اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرة ۲:۱۵۳) صبر اور نماز سے مدد لو۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ○ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ○ (قٓ ۵۰:۳۹-۴۰)

پس اے نبی ﷺ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا○ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا○ (الدھر ۷۶:۲۵-۲۶)

اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو، اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔

جہاں بھی صبر کا ذکر آئے گا وہاں سے کسی نہ کسی پہلو سے اللہ کا، اس کی حمد کا اور نماز کا ذکر آئے گا۔ اس لیے کہ صبر کی پوری استعداد اسی تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ جتنا یہ تعلق مضبوط ہوگا، یقین مضبوط ہوگا، اتنا ہی آدمی بے خوف اور اللہ سے ملاقات کا شائق ہوگا۔ کوئی چیز جو اللہ کی ہے اگر اس نے لے لی، تو اس پر کوئی گلہ نہیں ہوگا، کوئی صدمہ نہیں ہوگا۔ اللہ کی عزت اس کی عزت ہے، اور اس کی عزت اللہ کی عزت ہے۔ اسی کی خاطر وہ جما رہے گا۔ لہٰذا اس کو کسی بات کا صدمہ نہیں ہوسکتا۔ بڑے سے بڑا صدمہ تو جان کے ضیاع کا ہوتا ہے، اگر جان کا ضیاع بھی ہوجائے تو یہ ہمارے ہاں بہت معروف ہے اور کہا جاتا ہے: لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلِلّٰهِ مَا عَطَا، جو لے لیا وہ بھی اسی کا تھا، جو دیا ہے وہ بھی اللہ کا ہے۔ کوئی چیز ہماری نہیں ہے، سب کچھ اسی کا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ گویا سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے، سب اسی کی ملکیت ہے، ہمارے پاس تو ایک امانت ہے۔

جب نماز سے اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہوتی ہے، اللہ کی یاد دل میں بستی ہے، ڈیرے ڈالتی ہے، تو پھر صبر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ نماز کو خشوع کے ساتھ پڑھنے کے لیے بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ اس لیے بھی دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ نماز ٹھیک ہو تو صبر پیدا ہوتا ہے، اور نماز ٹھیک سے پڑھنے کے لیے صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہزاروں خیالات آتے ہیں، ہزاروں وسوسے پریشان کرتے ہیں، ان کے اوپر قابو پانا اور ان کے مقابلے میں اللہ کو یاد رکھنا، اس کے لیے بڑے ضبط اور بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ حصولِ صبر کے لیے ایک جامع نسخہ ذیل کی آیات میں بیان کیا گیا ہے:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲: ۴۵-۴۶)

صبر اور نماز سے مدد لو، بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر ان فرماں برداروں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

گویا صبر اور نماز سے مدد مانگی جائے اور یہ مدد مانگنا بڑا مشکل ہے، سوائے ان کے جو خشوع کی کیفیت رکھتے ہیں، جن کے دل اللہ کے آگے پست ہیں، یا جن کے دل اللہ کے ذکر سے پگھل جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں، جن کو اس کا دھڑکا لگا رہتا ہے، کہ اللہ سے ملاقات کرنی ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، یعنی ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، کے اندر پورے صبر کا نسخہ آ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس اعلیٰ اخلاقی مقام پر پہنچائے، اور اس کو حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی) (ترجمان القرآن، اکتوبر نومبر ۲۰۰۶ء)

❖ ❖ ❖

شائع کردہ: منشورات، منصورہ، لاہور ۵۴۷۹۰-فون: ۵۴۳۴۹۰۹، فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴
قیمت: ۱۱ روپے، کوڈ: 00112